الفاظِ طلاق سے متعلقہ اُصولوں کی تفہیم وتشریح

مفتی شعیب عالم

(آٹھویں قسط)

چودھواں فائدہ

قضاء اور دیانت

دیانت بندے اور اس کے رب کے درمیان کا معاملہ ہے، جس کا مدار نیت پر ہے۔ اس کی حقیقت قیامت کے دن آشکارا ہوگی، کسی اور کو اس میں دست اندازی کا حق نہیں ہے۔ مفتی کا اصل منصب دیانت ہی کا حکم بتانا ہے۔ جو شخص جس طرح اپنی منشا بیان اور اپنی نیت کا اظہار کرے، مفتی اسی کے مطابق اُسے حکم بتانے کا پابند ہے، چاہے وہ اپنی نیت میں سچا ہو یا جھوٹا، اس کی نیت امر واقعہ کے مطابق ہو یا مخالف۔ حقیقتِ حال کی تفتیش اور امرِ واقعہ کی تحقیق مفتی کا منصب نہیں، وہ نیت کے مطابق حکم بتا کر اصل معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے گا۔ اگر بتانے والا اپنے بیان میں سچا ہے تو اجر وثواب پائے گا اور اگر جھوٹا ہے تو مفتی کا فتویٰ اسے کوئی فائدہ نہ دے گا اور وہ خدا کے ہاں ماخوذ ہوگا۔ اس کے برعکس قضاء بندے اور بندے کے درمیان کا معاملہ ہے، جس کا تعلق ظاہر کے ساتھ ہے اور قاضی ظاہر پر عمل کا مکلّف ہے۔

’’المفتی یفتی بالدیانة وا لقاضی یقضی بالظاهر۔‘‘(۱)

مفتی اور قاضی کا یہ فرق ہے کہ مفتی کا تقرر حاکم وقت کی طرف سے نہیں ہوتا، اس لیے وہ قوتِ نافذہ بھی نہیں رکھتا۔ اگر ریاست کی طرف سے مفتی کا تقرر ہو پھر بھی مفتی کے منصب کے لیے حاکم کی طرف سے تقرری کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔ اس کے برخلاف قاضی کے لیے تقرر شرط ہے اور وہ اس بنا پر قوتِ حاکمہ بھی رکھتا ہے۔ بہرحال مفتی ہر وہ شخص ہے جو فتویٰ دے، جبکہ قاضی کے لیے تقرر شرط ہے۔

مفتی فرضی اور غیر واقعی سوال پر بھی فتویٰ دے سکتا ہے، جب کہ قضاء کی بنیاد حقیقی اور یقینی امور پر ہوتی ہے۔ قضاء کی تحدید وتخصیص ہوسکتی ہے۔ ’’القضاء یختص بزمان ومکان‘‘ فقہ کا مشہور مسئلہ

ہے، مثلاً: خلیفۂ وقت خود یا اگر اُس نے اختیار وزیرِ عدل یا قاضی القضاۃ کو تفویض کیا ہے تو وہ اس مفوضہ اختیار کو استعمال میں لاتے ہوئے قاضی کو پابند کرسکتا ہے کہ وہ دیوانی یا صرف فوجداری مقدمات کی سماعت کرے یا ایک خاص مالیت سے زیادہ یا سنگین نوعیت کے مقدمات کی سماعت نہ کرے یا پھر اس کا علاقائی اختیارِ سماعت محدود کرسکتا ہے، مثلاً: یہ کہ تحصیل یا ضلع کی حدود سے باہر کے مقدمات اس کی عدالت میں درج نہیں کیے جاسکتے، وغیرہ۔ اس کے علاوہ قضاء کا دائرہ فی نفسہ بھی محدود ہے، جب کہ فتویٰ کا دائرہ مکلّف کی پوری زندگی تک پھیلا ہوا ہے۔

اگر قرائن وآثار نیت کو جھٹلاتے ہیں تو قاضی انہیں نظر انداز نہیں کرسکتا، کیونکہ وہ اقرار، شہادت، اور ظاہری شواہد وقرائن کو زیرغور لانے کا پابند ہے، پھر اگر اس کا فیصلہ واقعہ کے مطابق ہے تو اس کی خلاف ورزی دنیا اور آخرت میں پکڑ کا باعث ہے اور اگر حقیقت حال کے خلاف ہے تو دنیا میں بہرحال اس کی خلاف ورزی قابل مؤاخذہ ہے۔

ایک معاملہ کب تک دیانت کا معاملہ رہتا ہے اور کب قضاء کی حدود میں داخل ہوجاتا ہے؟ جب تک معاملہ قاضی کی عدالت میں پیش نہ ہو وہ دیانت کے ذیل میں آتا ہے، اگرچہ پوری دنیا اس سے باخبر ہو اور جب وہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوجاتا ہے تو وہ قضاء کی حدود میں داخل ہوجاتا ہے، اگرچہ صاحب معاملہ اور قاضی کے علاوہ کوئی اور اس پر مطلع نہ ہو۔

قضاء اور فتویٰ دونوں کا وجود مسلم ریاست اور مسلمان معاشرے کے لیے ناگزیر ہے۔ دونوں اسلامی نظام عدل کا حصہ ہیں اور اس لحاظ سے ایک ہی جڑ کی شاخیں اور ایک ہی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، دونوں ایک دوسرے کی معاون ومددگار اور ایک دوسری کو قوت وطاقت بہم پہنچاتی ہیں۔ قضاء خالص عدالتی کارروائی ہے تو فتویٰ نیم عدالتی ہے۔ بہت حد تک دونوں کی شرائط بھی یکساں اور دائرہ بھی مشترکہ ہے، مگر اس کے باوجود یہ دونوں الگ الگ شعبے سمجھے گئے ہیں۔ نبوت کی ذات بابرکات تو تمام ہی صفات کی مالک اور ہر حیثیت کی جامع تھی۔ وحی کی ترجمانی، سلطنت کی حکمرانی، رعایا کی نگہبانی، فوجوں کی سالاری، الغرض صدہا صفات سمٹ کر ایک ہی وجود میں جمع ہوگئی تھیں۔ پیغمبر علیہ السلام کے بعد حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم میں سے بھی ہر ایک کی ذات مجموعۂ صفات اور شخصیت کئی شخصیات پر مشتمل تھی، مگر بعد میں باستثنائے ایک شخصیت کے، جامعیت اور مرکزیت کی وہ شان باقی نہ رہی، صفات بٹ کر کئی ایک میں تقسیم ہوگئیں، مناصب علیحدہ اور شعبے متفرق ہوگئے، اس وقت سے قضاء اور افتا بھی الگ ہوگئے اور اسی طرح علیحدہ چلے آرہے تھے کہ ایک وقت ایسا آیا کہ انتظامی لحاظ سے تو یہ دونوں شعبے الگ ہی رہے، مگر علمی حیثیت سے قضاء کا شعبہ فتویٰ کے تابع ہوگیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ایک مرتبہ پھر اس ابدی صداقت اور آفاقی اصول کا ظہور ہوا کہ علم غلبہ اور برتری ہے اور جہالت مغلوبیت اور محکومیت ہے۔ جب قاضیوں

www.banuri.edu.pk

میں جہالت عام ہوگئی تو اس کی تلافی مفتی کے فتوی سے کی جانے لگی۔ مفتی حکم شرعی بتا دیا کرتا تھا اور قاضی اسے نافذ کر دیا کرتا تھا۔ مگر قاضی کے لیے دیانت اور قضاء کا فرق سمجھنا دشوار تھا، جس کی وجہ سے یہ امکان تھا کہ کہیں وہ اپنے منصب کے برخلاف حکمِ دیانت پر فیصلہ نہ کر دے، اس لیے مفتی حضرات دیانت کا حکم صرف زبانی بتا دیا کرتے تھے، اس کی تحریر نہیں دیتے تھے اور اگر تحریر دیتے تو اس میں یہ صراحت کر دیتے تھے کہ قاضی اس کے مطابق فیصلہ نہ کرے۔ دونوں صورتوں میں مقصد یہی ہوا کرتا تھا کہ قاضی اپنی جہالت کے سبب حکمِ دیانت پر فیصلہ نہ کر دے، اس طرح قضاء اور فتوی قریب آتے چلے گئے اور دھیرے دھیرے فتوی نے قضاء کی حیثیت اختیار کر لی اور آہستہ آہستہ مفتی نے قاضی کا منصب سنبھالنا شروع کر دیا۔ اس کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ جب قاضی مفتی کے فتوی کے مطابق فیصلہ کرنے لگا تو مفتی نے بھی قضاء کا حکم لکھنا شروع کر دیا، تاکہ قاضی اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ اس طرح قضاء کے مسائل کو شہرت بھی ملی اور وہ مدون بھی ہوئے، جبکہ دیانت کے مسائل یہ درجہ حاصل نہ کر سکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ عام کتابوں میں زیادہ تر قضاء کے مسائل درج ہیں، دیانت کے مسائل کم مذکور ہیں۔ مفتی اگر محقق نہ ہو تو وہ اسی کے مطابق فتویٰ دے دیتا ہے، اس طرح شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ قاضی کی عمل داری میں مداخلت کر جاتا ہے۔ یہ مداخلت کسی اہمیت کے لائق نہ ہوتی، اگر قضاء اور دیانت کے احکام ہر ہر معاملے میں ایک ہوتے، مگر جب ایسا نہیں ہے تو ہر ایک کو اپنی حدود تک محدود رہنا ہی مناسب ہے:

''لكن يكتب (المفتي) بعدهٗ ولا يصدق قضاءً لان القضاء تابع للفتوى في زماننا لجهل القضاة ، فربما ظن القاضي أنه يصدق قضاءً أيضا۔''(۲)

''المراد من قولهم يدين ديانةً لا قضاءً أنه إذا استفتىٰ فقيها يجيبه على وفق ما نوى، ولكن القاضي يحكم عليه بوفق كلامه ولا يلتفت إلى نيته إذا كان فيما نوى تخفيف .... جرى العرف في زماننا أن المفتي لا يكتب للمستفتي مايدين به بل يجيبه عنه باللسان فقط ، لئلا يحكم له القاضي لغلبة الجهل على قضاة زماننا۔''(۳)

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحریرات میں دونوں کے فرق اور خلط پر اپنی عادت کے موافق بڑی فاضلانہ بحث اور محققانہ تبصرہ کیا ہے۔ قضاء و افتاء میں دو تین طرح سے فرق ثابت کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''محقق علما نے لکھا ہے کہ مفتی قضاء کے مسئلے میں مداخلت نہ کرے۔ عام مفتی فی زماننا اس نکتہ سے ناواقف ہیں اور وہ فتوے کے ساتھ ساتھ قضاء میں بھی مداخلت کر جاتے ہیں، حالانکہ یہ جائز نہیں ہے۔ اور میں اس کی وجہ یہ سمجھتا ہوں کہ عام فقہی کتابوں میں مسائل قضاء مذکور ہیں، دیانت کے مسائل موجود کتابوں میں مہیا نہیں، ان کا اہتمام

مبسوطات میں ہے۔ عصر حاضر کے غریب مفتیوں کی وہاں تک رسائی نہیں تو وہ ان ہی مسائل کا ذکر کر دیتے ہیں جو قضاء کی فہرست میں آتے ہیں۔ اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ سلطنت عثمانیہ میں قاضی حنفی تھا اور مفتی چاروں مذاہب کے تھے، حنفی قاضی ان کے فتوے کے مطابق فیصلہ کرتا، مفتیوں نے بھی قضاء کے مسئلے لکھنا شروع کئے، تاکہ حنفی قاضی ان کی تنفیذ کرے، اس طرح قضاء کے مسئلے شائع ذائع ہوگئے اور دیانت کے مسائل عام شہرت حاصل نہ کرسکے، حالانکہ دیانت اور قضاء میں اتفاق ضروری نہیں، بلکہ کبھی دونوں کے احکام بالکل ایک دوسرے سے مخالف ہوتے ہیں۔'' (۴)

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا کلام اپنے مفہوم اور مدعا میں واضح ہے اور حاصل اس کا یہ ہے کہ مفتی اگر مختصرات اور متداولات کے ساتھ مبسوطات اور مفصلات پر نظر نہ رکھتا ہو، بالفاظ دیگر اگر اس کا مطالعہ محدود ہو اور نظر وسیع نہ ہو تو وہ ایک طرح کی ''مداخلت بے جا'' کا مرتکب ہوجاتا ہے۔ دیانت کے مسائل کیوں شہرت حاصل نہ کرسکے اس کی بڑی اور اہم وجہ بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمادی ہے، اس لیے اس پر بحث کو طول دینے اور مزید تشریح اور حاشیہ آرائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تاہم اس مقام پر یہ سوال ذہن میں کھلبلاتا ہے کہ جب مفتی کا منصب دیانت پر فتویٰ دینا ہے تو پھر اہل افتاء دیانت کے مطابق فتویٰ کیوں نہیں دیتے ہیں؟ یہ سوال اس عموم کے ساتھ تو مبالغہ پر مبنی اور خلاف حقیقت معلوم ہوتا ہے، تاہم کنایات کے متعلق اس میں کوئی خاص مبالغہ محسوس نہیں ہوتا، مطبوعہ فتاویٰ جات اور مختلف دارالافتاؤں سے جاری جوابات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ یقیناً اہل افتاء اس کی کوئی معقول توجیہ پیش کریں گے اور وسعت مطالعہ رکھنے والے اہل علم کی نگاہ سے اس کا کوئی ٹھوس جواب بھی گزرا ہوگا اور وہی اس کا درست جواب ہوگا، تاہم جو وجہ فہم ناقص میں آتی ہے اور ممکن ہے کہ درست نہ ہو، وہ یہ ہے کہ دیانت کے مسائل پر فتویٰ نہ دینے کی بڑی وجہ خود معاشرے میں دیانت کی کمی اور قضاء شرعی کی عدم دستیابی ہے۔

لوگ ظاہری قرائن اور مضبوط شواہد وآثار کے برخلاف نیت بیان کرتے ہیں، بسا اوقات یہ قرائن اس حد تک مضبوط اور ناقابل تردید ہوتے ہیں کہ سب مل کر ٹھوس شہادت جیسی قوت رکھتے ہیں اور انہیں ملاحظہ کرنے کے بعد دل گواہی دیتا ہے اور کھلی آنکھوں نظر آتا ہے کہ ناقابل انکار حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اگر دیانت اس معیار کی ہوتی جس طرح کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی تو اسے بنیاد اور معیار بنانے میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہیں تھا، بلکہ عین حکم شرعی تھا، مگر جب دیانت کا وہ معیار نہیں رہا اور دوسری طرف قضاء شرعی بھی موجود نہیں ہے تو ایسے حالات میں مصلحتِ شرعی مفتی کو مداخلت پر مجبور کرتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو شریعت میں اس کے نظائر بھی موجود ہیں، مثلاً: دورِ نبوت میں اگر کوئی شخص اپنی زوجہ کو ایک

ہی مجلس میں تین مرتبہ طلاق کے الفاظ دہراتا اور اپنی نیت تاکید کی بیان کرتا تو دیانت کے برتر اور اعلیٰ معیار کے پیش نظر اس کی تصدیق کی جاتی تھی، مگر جب قلوب کا وہ حال نہ رہا تو دورِ فاروقی میں ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی قرار دی گئیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس پر اتفاق کیا۔ اس فیصلے کی روح وہی زمانہ کا تغیر اور دیانت کی کمی تھی۔ جس صورت میں بیوی طلاق کا مسئلہ دریافت کرتی ہے، اس صورت میں حکم قضاء پر فتویٰ دینے کی یہ توجیہ پیش کی جاسکتی ہے کہ بیوی کی حیثیت قاضی کی ہوتی ہے، گویا وہ پوچھنا چاہتی ہے کہ بحیثیت قاضی کے میرے لیے اس مسئلے میں کیا حکم ہے؟ اس لیے اسے حکمِ قضاء بتادیا جاتا ہے۔ تحکیم میں بھی قضاء کا رنگ نمایاں ہوتا ہے، اس لیے مفتی بحیثیت فیصل اور حَکَم کے حکمِ قضاء پر فیصلہ کردیتا ہے۔

بہر حال عوامل اور اسباب کچھ بھی ہوں، مفتی کا اصل منصب دیانت کا حکم بتانا ہے، اور اپنے منصب کے تقاضے کے پیش نظر وہ طلاق کے مسائل میں شوہر کی نیت پر فتویٰ دینے کا پابند ہے۔ ظاہری قرائن جسے طلاق کے باب میں دلالت حال سے تعبیر کرتے ہیں، اس پر فیصلہ مفتی نہیں، بلکہ قاضی کا منصب ہے۔

صریح سے دیانۃً عدم وقوع

صریح نیت کا محتاج نہیں ہوتا ہے، لیکن اگر شوہر صریح میں طلاق کے علاوہ کسی اور معنی کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا دعویٰ قابل قبول ہے یا نامقبول ہے؟ اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے کہ صریح کے استعمال کے وقت نیت طلاق کی ہو یا کچھ نیت نہ ہو، طلاق واقع ہوجائے گی۔ تاہم جس صورت میں شوہر طلاق کے علاوہ کچھ اور نیت بیان کرتا ہے، اس صورت میں اختلاف ہے، بعض کے نزدیک قضاءً تو طلاق واقع ہوجائے گی، کیوں کہ شوہر نے صریح کا استعمال کیا ہے، مگر دیانۃً واقع نہ ہوگی، کیوں کہ اس کی نیت طلاق کی نہیں تھی، صاحبِ بحر علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ کا یہی موقف ہے۔ یہ عبارت جو ایک مسلمہ اصول کی طرح کتابوں میں منقول چلی آرہی ہے کہ صریح نیت کا محتاج نہیں ہوتا ہے، یعنی ''الصریح لا یحتاج إلی النیة''، شیخ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد صرف قضاءً ہے، دیانۃً صریح بھی نیت کا محتاج ہے۔ صاحبِ بحرؒ کا استدلال ایک تو اس جزیے سے ہے کہ اگر شوہر نے ''أنت طالق'' کہا، مگر اس کی نیت نکاح کی بندش سے آزادی دینے کی نہیں، بلکہ قید سے رہائی دینے کی تھی، اسی طرح اگر وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر سبقتِ لسانی سے اس کی زبان سے ''أنت طالق'' نکل گیا تو دونوں صورتوں میں صرف قضاءً طلاق واقع ہوگی، دیانۃً نہ ہوگی، کیوں کہ اس کی نیت طلاق کی نہ تھی۔

صاحبِ بحرؒ کا موقف نقل کرنے کے بعد علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تردید کی ہے۔ پہلے جزیے کا جواب یہ دیا ہے کہ شوہر نے صریح کے لفظ سے طلاق کے علاوہ ایک ایسا مطلب مراد لیا ہے جس کا لفظ میں احتمال ہے اور دوسرے جزیے میں شوہر کا مقصد ہی بیوی کو طلاق دینے کا نہیں ہے، اس لیے دونوں

جزئیات سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ صریح سے دیانۃً طلاق کے وقوع کے لیے شرط ہے کہ شوہر صریح میں طلاق کے علاوہ کوئی اور معقول تاویل نہ کرتا ہو اور اس کا قصد طلاق کے لفظ سے طلاق دینے کا ہو، مگر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صریح میں طلاق کی نیت کرنا بھی شرط ہے۔

دونوں جزئیات کا جواب ذکر کرنے کے بعد علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی رائے کی تائید میں دو دلیلیں پیش کی ہیں: ایک تو یہ کہ اگر شوہر نے ''أنت طالق'' کہا اور پھر کہتا ہے کہ میری نیت بیوی کو نکاح سے آزادی دینے کی نہیں، بلکہ عمل سے آزاد کرنے کی تھی تو از روئے قضاء و دیانت دونوں طرح طلاق واقع ہو جائے گی، حالانکہ شوہر نے طلاق کے علاوہ معنی کی نیت کی تھی، اس لیے چاہیے تھا کہ طلاق واقع نہ ہوتی۔ دوسرے یہ کہ اگر شوہر نے بطور'' ہزل'' طلاق دی تو قضاءً اور دیانۃً دونوں طرح طلاق واقع ہوگی، حالانکہ ہزل (مزاح) کرنے والے کا مقصد لفظ سے اس کا مطلب نہیں ہوتا ہے۔ وہ سبب کو عمل میں لاتا ہے، مگر مسبب کا ارادہ نہیں کرتا ہے۔

فتاویٰ شامی کا متعلقہ مقام ملاحظہ کرنے کے بعد جو کچھ فہم میں آتا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ صریح سے دیانۃً طلاق کا وقوع نیت پر موقوف نہیں ہے۔ جن جزئیات میں عدم وقوع کا ذکر ہے، وہاں کوئی اور شرط مفقود ہے، مثلاً:

شوہر نے لفظ کا قصد نہیں کیا ہے۔

یا شوہر صریح زبان پر لایا ہے، مگر وہ اس لفظ کا مطلب نہیں جانتا ہے۔

یا سبقت لسانی سے صریح اس کی زبان سے نکل گیا ہے۔

یا اس نے طلاق کی اضافت بیوی کی طرف نہیں کی ہے۔

یا پھر وہ صریح کے معنی میں کوئی مناسب، معقول اور قابل قبول تاویل کرتا ہے۔

اگر درج بالا صورتوں میں سے کوئی صورت ہو تو صریح سے دیانۃً بھی طلاق واقع نہ ہوگی، مگر چونکہ اس نے صریح کا استعمال کیا ہے، اس لیے قضاءً اس کی نیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ (۵)

صریح سے قضاءً طلاق کا عدم وقوع

دیانت پر کلام کے بعد اب ہمارے سامنے قضاء کا مسئلہ ہے کہ کن صورتوں میں صریح سے قضاءً بھی طلاق واقع نہ ہوگی۔ اس بارے میں کوئی واضح اور متعین اصول تو معلوم نہیں، تاہم ایک اصول تشکیل دیا جا سکتا ہے کہ جن صورتوں میں کسی شرط کے مفقود ہونے سے دیانۃً طلاق واقع نہ ہو، جیسا کہ پچھلے عنوان میں اس کی مثالیں گزر چکی ہیں، ان صورتوں میں اگر کوئی ایسا منفی قرینہ بھی موجود ہو جو طلاق کے عدم وقوع پر دلالت کرتا ہو تو شوہر کا قول قضاءً بھی قابلِ قبول ہوگا اور عدالت طلاق کے عدم وقوع کا حکم جاری کرے گی، مثلاً: شوہر طلاق کا لفظ استعمال کرتا ہے اور اس میں کوئی معقول اور قابل قبول تاویل

کرتا ہے، مثلاً کہتا ہے کہ میری نیت اسے نکاح سے نہیں بلکہ قید سے آزاد کرنے کی تھی تو از روئے دیانت اس کی نیت معتبر ہے، کیونکہ لفظ میں اس کی گنجائش ہے۔ اب اگر یہی لفظ اس سے جبر واکراہ کے ذریعے کہلوایا گیا ہو تو قضاءً بھی طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ جبر واکراہ عدم طلاق کا قرینہ ہے۔ قاضی چونکہ ظاہر پر عمل کا مکلّف ہے، اس لیے جب خارجی ذریعے سے اس کی نیت کی تصدیق ہوگئی تو قاضی اس کے مطابق فیصلے کا پابند ہے۔ اس اصول کو مزید وسعت دی جاسکتی ہے، مثلاً شوہر طلاق کا تکرار کرتا ہے اور نیت تاکید کی بیان کرتا ہے تو عنداللہ اس کی نیت مقبول ہے، کیونکہ اس کا کلام تاکید کا امکان رکھتا ہے، مگر عدالت اس کی نیت کو خاطر میں نہیں لائے گی، کیونکہ اصل عدم تاکید ہے اور شوہر کا بیان ظاہر کے خلاف ہے، لیکن اگر ظاہر سے بھی شوہر کی تصدیق ہوجائے اس طرح کہ عرف میں اس لفظ کو تاکیداً دہرانے کا رواج ہو تو عدالت بھی عدم وقوع کا حکم جاری کرے گی۔ اسی طرح شوہر کا کلام صریح اضافت سے خالی ہے اور وہ طلاق کی نیت کا بھی انکار کرتا ہے تو دیانت میں طلاق واقع نہ ہوئی، اس کے ساتھ اگر کوئی قرینہ بھی ایسا نہ ہو جس سے بیوی کو طلاق دینے کا غالب ذہن بنتا ہو تو قضاءً بھی طلاق واقع نہ ہوگی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ صریح سے اگر کوئی اور مطلب اور معنی مراد لیا جائے اور صریح میں اس کا احتمال ہو تو دیانۃً طلاق واقع نہ ہوگی اور اگر اس کے ساتھ کوئی قرینہ بھی ایسا ہو جو غیر طلاق پر دلالت کرتا ہو تو قضاءً بھی طلاق نہ ہوگی۔ (۶)

کنایہ سے وقوع وعدم وقوع

کنایہ میں حل طلب سوال یہ ہوتا ہے کہ شوہر کی نیت کیا تھی؟ اس نے کس غرض اور نیت سے کنایہ کا استعمال کیا ہے؟ اگر شوہر خود اظہار کرلیتا ہے کہ اس کا ارادہ طلاق دینے کا تھا تو اس کی نیت معتبر اور اس کا بیان قابل قبول اور اس کی بیوی پر طلاق واقع سمجھی جائے گی، کیوں کہ خود شوہر سے بڑھ کر کون اس کے قول کا شارح اور نیت کا ترجمان ہوسکتا ہے؟ لفظ اس کی نیت کا ساتھ دیتا ہے اور اس تہمت کی بھی نفی ہوجاتی ہے کہ اس نے تخفیف کی غرض سے اپنی نیت طلاق کی بیان کی ہے۔ اگر وہ طلاق کی نیت کا انکار کرتا ہے تو یہ بات بے غبار اور غیر اختلافی ہے کہ قاضی اس کی نیت کے مطابق نہیں، بلکہ دلالت حال کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کرے گا، مگر مفتی دلالت حال کو زیرغور لانے کا پابند ہے یا نہیں؟ اصولی حیثیت سے دلالت حال پر فیصلہ مفتی کا منصب نہیں ہے۔ یہ سوال کہ نیت نہ ہو تو کنایہ سے عنداللہ طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ نیت نہ ہو تو از روئے دیانت طلاق واقع نہ ہوگی، اگرچہ قرائن اور آثار وقوعِ طلاق پر دلالت کرتے ہوں:

''(قوله قضاء)قيد به لأنه لا يقع ديانةً بدون النية ، ولو وجدت دلالة الحال ، فوقوعه بواحد من النية أو دلالة الحال إنما هو فى القضاء فقط

کما ھو صریح البحر وغیرہ۔‘‘(۷)

الحاصل اگر نیت اور دلالت دونوں نہ ہوں تو نہ دیانۃً طلاق ہے نہ قضاءً۔ اگر دونوں ہوں یا صرف نیت ہوتو دونوں طرح طلاق واقع ہے۔ اگر نیت نہ ہو، مگر دلالت حال موجود ہوتو دیانۃً غیر واقع اور قضاءً واقع ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱:......الفتاوی البزازیۃ، کتاب الایمان، ج:۲، ص:۳۷۔

۲:......ردالمحتار، کتاب الحظر والاباحۃ، ج:۶، ص:۴۲۱، ط:سعید۔

۳:......تنقیح الحامدیۃ، ج:۱، ص:۳۰، ط: دارالمعرفۃ بیروت۔

۴:......حیات محدث کشمیریؒ، تالیف، حضرت مولانا انظرشاہ مسعودیؒ، ص:۴۴۲، ط: ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان)

۵:......’’ولو قال لها: أنت طالق ثم قال: أردت أنها طالق من وثاق لم يصدق في القضاء.... ويصدق فيما بينه وبين الله تعالىٰ لأنه نوىٰ مايحتمله كلامه في الجملة۔‘‘ (بدائع الصنائع، کتاب الطلاق، کتاب الصریح، فصل الصریح، ج:۳، ص:۱۶۱، ط: داراحیاء التراث العربی)

’’مطلب في قول البحر: إن الصريح يحتاج في وقوعه ديانة إلى النية (قوله أولم ينو شيئا) لما مر من أن الصريح لا يحتاج إلى النية، ولكن لابد في وقوعه قضاءً وديانةً من قصد إضافة لفظ الطلاق إليها عالما بمعناه ولم يصرفه إلى ما يحتمله كما أفاده في الفتح، وحققه في النهر، احترازاً عما لو كرر مسائل الطلاق بحضرتها، أو كتب ناقلا من كتاب امرأتي طالق مع التلفظ، أو حكى يمين غيره فإنه لا يقع أصلا مالم يقصد زوجته، وعما لو لقنته لفظ الطلاق فتلفظ به غير عالم بمعناه فلا يقع أصلا على ما أفتى به مشايخ أوزجند صيانة عن التلبيس وغيرهم من الوقوع قضاءً فقط، وعمالو سبق لسانه من قول أنت حائض إلى أنت طالق فإنه لا يقع قضاءً فقط، عما لو نوى بانت طالق الطلاق من وثاق فإنه يقع قضاء فقط أيضا. وأما الهازل فيقع طلاقه قضاءً وديانةً لأنه قصد السبب عالما بأنه سبب، فرتب الشرع حكمه عليه أراده أولم يرده كما مر، وبهٰذا ظهر عدم صحة مافي البحر والأشباه من أن قولهم إن الصريح لا يحتاج إلى النية إنما هو في القضاء، أما في الديانة فمحتاج إليها أخذا من قولهم: لونوى الطلاق عن وثاق أو سبق لسانه إلى لفظ الطلاق يقع قضاءً فقط أي لا ديانة، لأنه لم ينوه، وفيه نظر، لأن عدم وقوعه ديانة في الأول لأنه صرف اللفظ إلى يحتمله، وفي الثاني لعدم قصد اللفظ، واللازم من هذا أنه يشترط في وقوعه ديانة قصد اللفظ عدم التاؤيل الصحيح.، أما اشتراط نية الطلاق فلا بدليل أنه لو نوى الطلاق عن العمل لا يصدق ويقع ديانة أيضا كما يأتي مع أنه لم ينو معنى الطلاق وكذا لو طلق هازلا۔‘‘

(ردالمحتار، کتاب الطلاق، باب الصریح، مطلب فی قول البحر: ان الصریح یحتاج فی وقوعہ دیانۃ الی النیۃ، ج ۳/ ۲۵۰، ط: سعید)

۶:......’’لو نوى به الطلاق عن وثاق دين إن لم يقرنه بعدد، ولو مكرهاصدق قضاءً أيضًا (قوله صدق قضاءً) أي كمايصدق ديانة لوجود القرينة الدالة على عدم إرادة الإيقاع وهي الإكراه۔‘‘ (المرجع السابق، ج:۳، ص:۲۵۱، ط: سعید)

’’ولو نوىٰ به الطلاق عن وثاق دين (قوله دين) أي تصح نيته فيما بينه وبين الله تعالىٰ لأنه نوى ما يحتمله لفظه فيفتيه المفتي بعدم الوقوع، أما القاضي فلا يصدقه، ويقضي بالوقوع لأنه خلاف الظاهر بلا قرينة۔‘‘ (ردالمحتار، کتاب الطلاق، ج:۳، ص:۲۵۱، ط: سعید)

۷:......ردالمحتار، باب الکنایات، ج:۳، ص:۲۹۷، ط: سعید

(جاری ہے)